شہیدِ کربلا

حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر ایک نظرِ بصیرت

از

ابوالکلام آزاد

مولوی مجید حسن نے اپنے مدینہ پریس بجنور میں چھاپا
اور
[illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شہید کربلا

واقعۂ شہادت پر نظر بصیرت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قال اللہ تعالےٰ :- الحمد للہ رب العالمین ؕ الرحمن الرحیم ؕ مالک یوم الدین ؕ ایاک نعبد وایاک نستعین ؕ اھدنا الصراط المستقیم ؕ صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین ؕ

تنہا بروہ ام از صدق بجانِ شہداء
تا دل و دیدہ بخوناب بفشانم واندہ!

برادران عزیز!

آج جس حادثۂ کبریٰ اور شہادت عظمیٰ کے تذکار و درس کے لئے ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں وہ وقائع وحوادث اسلامیہ کا وہ عظیم الشان واقعہ ہے جو تاریخ اسلام کی اولین صدی سے لے کر اس وقت تک اپنے عجیب تاثر درد اور حیرت انگیز نتائج ذکر و تاثیر کے لحاظ سے نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ تمام حوادث محزنۂ عالم میں ایک عدیم النظیر امتیاز رکھتا ہے۔ اگر وہ تمام آنسو جمع کئے جائیں جو سنہ ۶۱ ہجری سے لے کر اس وقت تک اس واقعۂ جانسوز پر بہائے گئے ہیں۔ اگر وہ تمام درد، آہ و فغان و سوزِ ان یکجا کیا جائے جو ان تیرہ صدیوں کی لاتعداد و لاتحصیٰ اسلامی نسلوں کی [illegible]

دعوتِ درد

ہاں، یہ سچ ہے کہ رونے والے اس پر بہت روئے، ماتم کرنیوالوں نے ماتم میں کمی نہ کی، آہ و نالہ کی صداؤں نے ہمیشہ ہنگامۂ الم کی مجلس طرازیاں کیں، اور یہ سب کچھ اب تک اتنا ہوچکا ہے جتنا آج تک شاید ہی دنیا کے کسی حادثۂ غم کو نصیب ہوا ہو۔ تاہم تم یقین کرو کہ با ایں ہمہ اس حادثۂ عظیمہ کی دعوت اشک و حسرت اب تک ختم نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی دعوت درد کے اندر جو حقیقی طلب تھی، وہ اب تک لبیک کے سچے استقبال سے محروم ہے۔ تیرہ صدیاں مع اپنے دوران محرم و عشرۂ ماتم کے اس پر گذر چکی ہیں، لیکن اب تک خاک کربلا کے وہ ذرات خون آشام، جن کو آج بھی اگر نچوڑا جائے تو خون شہادت کے مقدس قطرے اس سے ٹپک سکتے ہیں، بدستور آنسوؤں کے لئے پکار رہے ہیں، خوں فشانیوں کے لئے داعی ہیں، آہ و فغاں کے لئے تشنہ ہیں، اضطراب و التہاب کے لئے بیقرار ہیں اور فضائے ریگ زار کرب و بلا کا ایک ایک گوشہ اب تک دیدہ ہائے اشک فشاں جگر ہائے سوختہ دلہائے دو نیم، اور زبانہائے ماتم سرا کے لئے اسی طرح چشم براہ ہے، جس طرح ۶۱ھ ہجری کی ایک آتش خیز دوپہر میں خون کی ندیوں کی روانی، تڑپتی ہوئی لاشوں کے ہنگامہ احتضار اور ظلم و مظلومی۔ جرح و مجروحی قتل و مقتولی کے ہنگامہ الیم کے اندر سے نالہ ساز طلب اور فغاں فرمائے دعوت تھا

شدیم خاک و لیکن ببوئے تربتِ ما ۔۔۔ تواں شناخت کزیں خاک مرد می خیزد!

لیکن اگر یہ دعوتِ درد محض اُس پانی کے لئے ہے جو ندیوں کی جگہ آنکھوں سے بہے، اگر یہ طلب غم محض اُن صداؤں کے لئے ہے۔ جن کا غوغا درختوں کے

ہوتا رہا ہے۔ اگر درد و کرب کی وہ تمام چیخیں، اضطراب والم کی وہ تمام پکاریں، سوزش و تپش کی وہ تمام بیقراریاں اکٹھی کی جاسکیں جو اس حادثہ کبریٰ کی یاد نے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے اندر ہمیشہ پیدا کی ہیں، تو اے عزیزان ماتم شعار کون کہہ سکتا ہے کہ خونفشانیہائے حسرت کا ایک نیا اٹلانٹک واوقیانوس سطح ارضی پر بہہ نہ جائیگا دود آہ وفغاں کی ہزار ہا بھٹیاں بھڑک نہ اٹھیں گی؟ اور درد والم کی چیخوں، حسرت کی صداؤں تڑپ کی بیچینیوں کے ہنگامۂ خونیں سے تمام عالم ایک شور زار نالہ و بکا نہ بن جائیگا۔

تاہم میں جو پیام پہنچانے کے لئے آج آیا ہوں، وہ اس تذکرے سے بالکل مختلف ہے۔ میں غم والم کی شدت وکثرت کے اعتراف کی تاریخ نہیں ہوں آہوں کی صدا ہوں، بیقراری کی پکار ہوں، اضطراب کی دعوت ہوں، اور آہ آہ!! اے صد ہزار آہ و حرماں، کہ غم کے لئے بھوکا ہوں اور درد والم کے لئے یک قلم پیاس ہوں۔ پس میں آج ان آنکھوں کا تذکرہ نہیں کرتا جو بہت رو چکی ہیں۔ مجھے اُن آنکھوں کا سُراغ بتاؤ جو اب بھی رونے کے لئے نم آلود ہیں! میں اُن دلوں کی سرگذشت نہیں سُناتا جو تڑپتے تڑپتے تھک چکے ہوں، میں اُن دلوں کی تلاش میں نکلا ہوں جو اب بھی تہ و بالا ہونے کے لئے مضطرب ہیں مجھے اُن زبانوں سے کیا سروکار جن کو فغاں سنجیہائے ماضی کا ادعا ہے، آہ! میں تو اُن زبانوں کے لئے پکار رہا ہوں جن کے اندر غم و ماتم کی بھٹیاں سلگ رہی ہوں، اور اُن کا دھواں آج بھی کائنات نشاط نادانی کی اس تمام فضائے غفلت کو مکدر کر دے سکتا ہے، جس کو عیش و عشرت کے قہقہوں میں درد و عبرت کی ایک آہ بھی نصیب نہیں!

نہ داغ تازہ می خارد، نہ زخم کہنہ می کارد! یارب دلے کیں صورت بیجاں نمی خواہم

تسلسل صدا، اور ہنگامۂ غوغا ہی کے لئے نہیں ہوتیں جو آنسوؤں، فغانوں اور ماتموں کے نام سے ظہور میں آجائیں اور اگر ان کا یہی مقصد ہوتا تو اس کے لئے انسان کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ کتنے ہی سمندر پانی سے بھرے ہوئے ہیں اور کتنے ہی جنگل شور و غوغا سے ہنگامہ زار ہیں۔ بلکہ یہ دعوت، یہ پکار، یہ طلب، "ہَل مِن مجیب" فی الحقیقت ان آنسوؤں کے لئے ہے جو صرف آنکھوں ہی سے نہیں بلکہ دل سے بہیں۔ وہ اُن آہوں کا دھواں مانگتی ہے جن کی لپٹیں صرف مُنہ ہی سے نہیں بلکہ اعماق قلب سے اُٹھیں وہ صرف ہاتھوں ہی کے ماتم کے لئے نہیں پکارتی، بلکہ دل کے ماتم کی محض ایک صدائے حقیقت کے لئے تشنہ ہے۔ اگر تمہارے پاس اس کے لئے آنکھوں کا آنسو نہ ہو تو اُسے کوئی شکایت نہیں لیکن آہ تمہاری غفلت، اگر تمہارے پہلوؤں میں کوئی زخم نہ ہو جس سے پانی کی جگہ خون بہے! اگر تمہاری زبانوں کو درد کی چیخ نہیں آتی تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن آہ یہ کیا ہے کہ تمہارے دلوں کے اندر حقیقت شناسی کی ایک ٹیس، عبرت کی ایک ٹپک، بصیرت کی ایک تڑپ، احساس صحیح و حق کا ایک اضطراب بھی نہیں۔

طوفان نوح لانے سے اے چشم فائدہ؟ دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں!

اللہ اللہ سید الشہداء مظلوم کی مظلومی اور یا للعجب غفلت و نادانی کی بوقلمونی! اس سے بڑھ کر دنیا میں "مظلومی" مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ دشمنوں اور دوستوں، دونوں نے اس پر ظلم کیا۔ دشمنوں نے اس کی شہادت عظیمہ کی عظمت مٹانی چاہی مگر دوستوں نے بھی اس کی شہادت کی اصلی تقدیس و شرف کے لئے سچائی اور عمل کا ایک آنسو بھی نہ بہایا۔ دشمن تو دشمن تھے اس لئے اُنھوں نے اُسکی دعوت حق کو مٹانا چاہا، مگر دوست دوست ہو کر بھی اس کی دعوت کی پیروی نہ کر سکے! وتراھم ینظرون الیك وھم لا یبصرون (۵۶ : ۸۵)

جھنڈ، چڑیوں کے گھونسلوں، دریاؤں کے سیران کی جگہ انسانوں کی زبانوں سے بلند ہو، اگر یہ انتظار الم محض اُس ماتم کے لئے ہے جو پتھروں کے ٹکرانے کی جگہ انسانی دست و بازو کی ٹکر سے ہنگامہ ساز ہو۔ تو اے برادران غفلت شعار! وائے چشمان خواب آلود! بلا شبہ یہ سب کچھ ہو چکا، اور بلا شبہ سوال کو جواب، دعوت کو لبیک، اور طلب کو مطلوب مل چکا۔ اگر انسان کا بچہ بھوک سے روتا اور روٹی کے لئے آنکھوں کو سُرخ کر لیتا ہے تو انسانوں کے بڑے بڑے گروہ کیوں نہیں آنسو بہا سکتے؟ اگر درختوں کے جھنڈ ہوا سے ہل کر چند لمحوں کے لئے دنیا کو شور و غوغا سے لبریز کر دیسکتے ہیں تو آدم کی اولاد اپنی آہ و بکا سے کیوں آسمان کو سر پر نہیں اُٹھا سکتی۔ اگر بیجان و بے روح پتھر دوسرے پتھر پر گر کر رعد و برق کا ہنگامہ پیدا کر دیسکتا ہے تو تم کہ روح اور ارادہ رکھتے ہو، اپنے دستہائے ماتم کناں سے کیوں ایک ہنگامہ زار دہشت گرم نہیں کر سکتے؟ کیا تم کو دنیا کی اُن آنکھوں کی خبر نہیں جو روتی ہیں حالانکہ اُن سے ایک آنسو بھی نہیں بہا؟ کیا تم نے اُن زبانوں کے متعلق کچھ نہیں سنا جو چیختی ہیں حالانکہ اُنہوں نے ایک چیخ بھی نہ پائی۔ اور کیا تم نے اُن جسموں کا تماشہ نہیں دیکھا جو تہ و بالا ہوتے ہیں حالانکہ اُن کو ایک تڑپ بھی نصیب نہیں ہوئی؟ پھر کیا اس غفلت آباد ہستی میں وہ دل بھی نہیں ہیں جو گو دل ہیں مگر دل نہیں ہیں۔ کیونکہ دل کی طرح نہیں سوچتے؟ کیا وہ کان بھی نہیں ہیں جو سامع ہیں مگر کان نہیں ہیں کیونکہ نہیں سُنتے! اور کیا ایسی آنکھیں بھی نہیں جو گو بصیر ہیں مگر آنکھیں نہیں ہیں کیونکہ نہیں دیکھتیں؟ لھم قلوب لا یفقھون بھا، ولھم اٰذان لا یسمعون بھا، ولھم اعین لا یبصرون بھا، اولٰئک کالانعام بل ھم اضل، واولٰئک ھم الغافلون۔ (۷: ۱۷۸)

پس اے عزیزان من! درد و الم کی یہ پاک دعوتیں صرف اُس روانی آب

یہی چیز ہے جس کو تمام اقوام متمدنہ نے "مشاہیر پرستی" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اور یہی چیز ہے کہ ہر قوم اپنی قومیتوں کے بڑے بڑے بانیوں، مذہبی معلموں، محب الوطنوں اور قومی شہیدوں کی یاد کو کبھی بھی مفقود ہونے نہیں دیتی۔

ہومر نے الیڈ لکھی، کالڈیا کے حجری کتب[1] خانہ میں وہ اینٹیں رکھی گئیں جن پر ناموران ملت کے مناقب و محامد کندہ تھے۔ عرب جاہلیت نے اپنے سلسلۂ انساب کا ایک حرف ضائع ہونے نہ دیا اور ذوالحجہ اور عکاظ میں اسلاف کے مفاخر و معالی کی داستاں سرائی قائم کی۔ مصریوں نے ایسے ایسے مینار[2] بنائے جو ہزاروں برسوں کے بعد بھی اپنی تعمیر اولین کی طرح محکم و استوار ہیں اور پھر انکے اندر اپنے ناموروں کی لاشوں کو حنوط (ممی) کر کے محفوظ کر دیا۔ ہندوستان کی مہابھارت کے معرکے کو قومی روایتوں میں داخل کر دیا۔ اور والمیک کی سحر طرازیوں نے نسلی مفاخر کی روح کو پژمردگی سے بچایا۔ اقوام قدیمہ کے یہ تمام اعمال صرف اسی حقیقت کے لئے تھے کہ اسلاف و مشاہیر کی یاد زندہ و قائم رکھی جاتی تھی۔

لیکن یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ اس تذکار و یادگار کا اصلی مقصد کسی واقعہ کو محض یاد رکھنا یا کسی نام کو فراموش نہ ہونے دینا بھی نہیں تھا۔ بلکہ کچھ اور ہی مقصد تھا۔ کیونکہ اگر یہی مقصد ہوتا تو اس کے لئے کسی خاص نام، کسی خاص واقعہ، کسی خاص حادثہ میں کوئی ممتاز خصوصیت نہ تھی۔ پچھلوں کو اگر محض یاد ہی رکھنا ہے تو اُسکے لئے بڑا اور چھوٹا، ادنیٰ و اعلیٰ، نیک و بد سب یکساں ہیں۔ کونسی وجہ ہے کہ کارتھیج کے مشہور "ہنی بال" کو یاد رکھا جائے اور ٹیٹس کو یاد نہ رکھا جائے جو اسی عہد میں گذرا تھا

[1] حجری کتب خانہ سے مقصود تمدن بابل و کالڈیا کا وہ عہد مدنی ہے۔ جبکہ کتابیں پتوں اور درخت کی چھالوں کی جگہ پتھر پر کندہ کر کے لکھی گئیں اور جن کا بڑا ذخیرہ بابل کے آثار عتیقہ میں موجود ہے۔ [2] اہرام مصری۔

پس سچا ماتم وہی ہے جو صرف ہاتھ ہی کا نہیں بلکہ دل کا ماتم ہو، اور دعوت درد کا اصلی جواب وہی ہے جو عبرت و بصیرت کی زبان سے نکلے۔ تمہاری آنکھیں اِس حادثہ پر بہت رو چکی ہیں، مگر اب تک تمہارے دل کا رونا باقی ہے اور اگر رونا ہی تو اپنے دل کو رُلاؤ، ورنہ صرف آنکھوں کی اس روانی کو لے کر کیا کیجئے جس میں دل کی اشک افشانی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ حالانکہ انسان کی ساری کائناتِ حیات صرف دل ہی کی زندگی سے ہے فانہا لا تعمی الابصار، ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ، تو نہ مر جائے　　کہ زندگی عبارت ہے تیرے جینے سے

آج ہمارا اجتماع اِسی لئے ہے کہ اس حادثۂ عظیمہ پر غور و فکر کی ایک نئی صف ماتم بچھائیں اور اُن حقیقتوں اور بصیرتوں کی جستجو میں نکلیں جن پر آنکھوں کی اشک افشانیوں سے زیادہ دل کے زخموں سے خون بہتا ہے اور ہاتھوں سے زیادہ روح پر ماتم طاری ہوتا ہے۔ فذکر، ان الذکریٰ تنفع المومنین۔

حقیقت تذکار مشاہیر

سب سے پہلی چیز جو اس سلسلہ میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ اس واقعہ کی یادگار اور اُس کا دائمی تذکار ہے۔

دنیا میں ہر قوم نے اپنے ماضی کے اُن واقعات و حوادث کی ہمیشہ تعظیم کی ہے جن کے اندر قوم و ملک کے لئے کوئی غیر معمولی تاثیر یا عبرت پائی جاتی تھی، اور ہمیشہ اُن انسانی بڑائیوں اور عظمتوں کی یاد کو یادگاروں، تہواروں، عمارتوں، تاریخوں، قومی روایتوں، اور قومی مجمعوں کے انعقاد کے ذریعہ زندہ رکھنا چاہا ہے۔ جن کے اندر خود اُس قوم کی کوئی عظمت اور بڑائی پوشیدہ ہے۔

اُنکی تعریف و ثنا ان اعمال کے لئے کی جائے جو انھوں نے نہیں کئے۔ حالانکہ حمد کا استحقاق تو اعمال ہی کو تھا، اسی کی مزید توضیح کرتا ہے۔ وَمَا یَعقِلُھَا اِلَّا العَالِمُون

ایک عالمگیر غلطی

لیکن دنیا کا خسران صرف اسی میں نہیں ہے کہ وہ سچائی کی طرف نہیں بڑھتی بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ بسا اوقات اس کی جانب قدم تو اُٹھاتی ہے، پر ایسا ہوتا ہے کہ راہ ہی میں گم ہو جاتی ہے اور جس طرح اس کی طرف نہ چل کر اس سے محروم تھی، ٹھیک ٹھیک اسی طرح اس کی طرف چل کر بھی محروم رہتی ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ قرآن حکیم نے انسان کے نقصان و خسران کے جو مختلف حالات بیان کئے ہیں اُن میں سے ایک زیادہ عام اور زیادہ پیش آنیوالی حالت کے لئے "ضلالت" کا لفظ اختیار کیا ہے۔ اور اسی سورۂ فاتحہ میں (جس کے ماتحت آج کی تقریر ہے) "مغضوب علیہم" کے ساتھ ایک اور گروہ کا باسم "الضالین" تذکرہ کیا گیا ہے "ضلالت" کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ تم کو معلوم ہے کہ "گمراہی" اور "راستہ میں بھٹک جانے" کے ہیں۔ اسی لئے متحیر اور غیر متعین نظر رکھنے والے پر بھی "ضال" کا اطلاق ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی متعین راہ اُس کے سامنے نہیں ہوتی۔ پس قرآن کریم نے نوع انسانی کی بدحالی و تباہی کی سب سے بڑی عام حالت کو اسی لفظ سے تعبیر کیا، اور اس میں بڑا نکتہ یہ ہے کہ بسا اوقات انسان کو اُٹھنے اور چلنے سے انکار نہیں ہوتا۔ وہ سفر تو کرتا ہے پر ہوتا یہ ہے کہ منزل مقصود کی حقیقی شاہراہ اُس پر نہیں کھلتی، اور وہ راہ ہی میں بھٹک کر رہ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ باوجود چلنے کے منزل مقصود سے اُسی طرح محروم رہتا ہے جس طرح وہ شقی و جاہد محروم رہا، جس نے چلنے کا قصد ہی نہیں کیا تھا۔ یہی حقیقت اصطلاح قرانی میں "تحبط اعمال" کی ہے۔ جس پر جا بجا مختلف

سو وہ اصلی روح حقیقت جو اجتماع انسانی کی اس سب سے زیادہ پُرانی رسم کے اندر کام کر رہی ہے۔ دراصل ناموں، وجودوں، شخصیتوں، اور محض تذکرہ و یاد آوری سے تعلق نہیں رکھتی۔ بلکہ اس سے اصلی غرض یہ تھی کہ جو اعمال حسنہ، عزائم ہمہ، نتائج عظیمہ اور بصائر و مواعظ جلیلہ اُن مشاہیر اور ناموروں کی زندگی سے وابستہ ہیں، اور جن کی یاد و تذکرہ کے اندر قوموں اور ملکوں کے لئے سب سے زیادہ موثر اور نافذ دعوت عمل و اتباع ہے انکی یاد کو ہمیشہ حی و قائم رکھا جائے اور مختلف ذریعوں سے ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں جن کی وجہ سے کبھی بھی آیندہ نسلیں ان اعمال حسنہ کے نمونوں کو اپنی نظروں سے اوجھل ہونے نہ دیں۔

پس یادگار دراصل انسانی افراد کی نہ تھی بلکہ انسان کے بہترین اعمال کی تھی، اور تذکرہ و یاد آوری شخصوں اور حادثوں کی نہ تھی، بلکہ اُن سچائیوں کی تھی جو وہ اپنی زندگی کے اندر رکھتے تھے۔ خدا نے ذات کی بڑائی اور عظمت صرف اپنی ہی کبریائی کے لئے مخصوص کر لی ہے اور دنیا کو جو کچھ دیا گیا ہے وہ صرف "عمل" کی بڑائی ہے۔ دنیا میں کوئی انسان بڑا نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ بڑا صرف ایک ہی ہے اور وہ فاطر السموات والارض ہے۔ البتہ "عمل" بڑا ہو سکتا ہے، اور اُس کی بڑائی سے اس کے حامل کے اندر بھی نسبتی اور اضافی بڑائی آجاتی ہے۔ پس ساری تعظیمیں، ساری تقدیسیں ہر طرح کا احترام و شرف جو دنیا میں کیا جا سکتا ہے یا تو خدا کے لئے ہے، یا پھر خدا کی سچائی اور اس کے قرار دئے ہوئے اعمال حسنہ کے لئے خود انسان کی ذات کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ الحمد للہ رب العالمین میں "الحمد" کے الف لام کا یہی مطلب ہے جسے میں نے آغاز تقریر میں تلاوت کیا اور انا خلقنا کم من ذکر و انثی وجعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (۴۹، ۱۴) سے اسی پر روشنی پڑتی ہے اور یریدون ان یحمدوا بما لم یفعلوا (۳، ۱۸۸) (یہ بدبخت چاہتے ہیں کہ

اُسوۂ حسنہ

اے برادرانِ ملت ! یہی حقیقت اعلیٰ ہے جسے قرآن حکیم نے "اسوۂ حسنہ" کے جامع ومانع لفظ سے تعبیر کیا ہے اور یہی مقام ہے جہاں آکر اسلام کی قوت اصلاح اور ختم نبوت کی اصلی علت آشکارہ ہو جاتی ہے کہ کس طرح اس نے دنیا کی تمام خرابیوں اور ضلالتوں سے محفوظ بھی کر دیا۔ جن کے اختلاط وآلودگی سے ان کی روح حقیقت اور تاثیر عمل بالکل فنا ہو گئی تھی

لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم مجید (۴۱: ۴۲) قرآن ایک ایسا معلم وہادی ہے کہ نہ تو اس کے آگے باطل جم سکتا ہے اور نہ اسکے پیچھے جگہ مل سکتی ہے وہ خدائے حکیم ومجید کا اُتارا ہوا ہے۔ پھر باطل کا یہاں کیا گذر ؟

ہاں باطل کیونکر اب اُسکے ساتھ مل سکتا ہے جبکہ وہ "حق خالص" ہے اور سچائی کے ساتھ جس قدر بھی گمراہی ملا دی گئی تھی، اُس سے انسان کے ہر اعتقاد کو بالکل صاف و پاک کر دیا ہے ؟ نیز جا بجا قرآن حکیم کو "ہادی" کہا کہ وہ انسان کو اس کے سفر اعمال میں ٹھوکروں اور گمراہیوں سے بچاتا ہے اور اسی طرح "شفا" کہا، کیونکہ وہ مثل مفید و نافع ادویہ کے ہے جو مریض کی اصلی قوت طبیعی کو مزید دانائی اور نشوونما دیتی ہیں، اور مضر اثرات مرض جو داخل طبیعت ہو گئے ہیں ان کو دور کر دیتی ہیں۔

"اسوہ" کہتے ہیں کسی فکر، کسی عمل، کسی وصف، کسی خاصہ کے ایک ایسے نمونہ کو جسے تم اس لئے اپنے سامنے رکھ لو کہ اس کی پیروی اور نقل کرو گے اور اُسکی سی باتیں اپنے اندر بھی پیدا کرنا چاہو گے۔

انسانی سعادت کے لئے تعلیم محض بالکل بیکار ہے۔ جب تک کہ اس تعلیم کے زندہ

پیرایوں میں زور دیا گیا ہے کہ فحبطت اعمالھم (۱۸، ۱۰۴) انکی تمام محنتیں، کوششیں اور راہ روی کی مشقت بالکل اکارت گئی اور اس کا کوئی پھل انہیں نہ ملا۔

چنانچہ اس "ضلالت عمل" کی ایک عمدہ مثال دنیا کی عالمگیر "مشاہیر پرستی" بھی ہے جو مقصد کے لحاظ سے ایک نہایت اہم عظیم المنفعت، حیات پرور اور سعادت بخش حقیقت تھی۔ لیکن با ایںہمہ اس بارہ میں ہمیشہ قوموں نے غلطی کی۔ اور اکثر حالتوں میں سخت ٹھوکر کھائی۔ وہ دنیا کی عالمگیر ضلالت کبریٰ جو اس کے ہر عمل میں حقیقت اور مقصد کو فنا کرتی اور ظواہر و رسوم کی اس سے پوجا کراتی ہے۔ افسوس کہ اس حقیقت کے لئے بھی ہلاکت بخش ہوئی اور گمراہیوں اور حقیقت ناشناسیوں سے اس طرح اس عمل عظیم کو آلودہ کر دیا گیا کہ لبا اوقات ہدایت کی جگہ ضلالت کا بہت بڑا پتھر ثابت ہوئی!!

انسان کی عالمگیر غلطی ہے کہ وہ ہر چیز کو اسکی روح کے لئے اختیار کرتا ہے لیکن آگے چل کر صرف اس کے جسم ہی کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ مشاہیر و سلف پرستی کا اصلی مقصد تو اعمال حسنہ کی یاد اور نیکی و صداقت کے عملی نمونوں کو پیروی و اتباع کے لئے قائم رکھنا تھا لیکن نتیجہ بالعموم یہ نکلا کہ اعمال کی یاد مٹ گئی اور محض انسانوں کی شخصیتوں اور ناموں کی پوجا ہونے لگی یعنی وہ چیز کہ کسی دوسرے مقصد کے لئے واسطہ و ذریعہ تھی خود ہی مقصود بالذات بن کر لوگوں کے عقائد و اعمال میں جاگزیں ہو گئی۔ اور حقیقت سے اس قدر بُعد و نسیان ہو گیا کہ محض رسوم و اسمار کی عظمت و پرستش ہی پر ہر شخص قانع ہو گیا!

یہی وجہ ہے کہ مشاہیر پرستی بسا اوقات بت پرستی کا دنیا میں ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔ اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ اعمال کی جگہ افراد و اسمار کی پرستش محض دو تین نسلوں کے بعد انسان کو بت پرستی تک پہنچا دیا۔

تھا کہ "کان خلقہ القرآن" اگر تم ان کے خلق عظیم کو معلوم کرنا چاہتے ہو تو قرآن کو دیکھ لو۔ یہاں حروف و الفاظ ہیں وہاں ایک پیکر مجسم تھا۔ یہاں قول ہے وہاں فعل تھا۔ یہاں چراغ ہے وہاں اسکی روشنی تھی حقیقت ایک ہی ہے جس نے ایک جگہ علم کی اور دوسری جگہ عمل کی صورت پائی ہے!!

اور یہی وجہ ہے کہ "سنت" "کتاب" کا ایک حقیقی جزو ہے اور مفہوم "کتاب" میں تبعًا داخل ہے۔ کوئی علیحدہ اور مستقل وجود نہیں رکھتی۔ جو ظاہر بیں اس حقیقت سے بے خبر ہیں وہ قرآن کے ساتھ "حدیث" کا لفظ سنتے ہیں تو اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ "حدیث" کی پیروی کا اثبات کرنا ہے حالانکہ "سنت" کی اطاعت "کتاب" کی اطاعت میں داخل ہے اور "سنت" علم قرآنی ہی کی عملی تفسیر ہے۔

اگر یہ سچ ہے کہ جناب امیر علیہ السلام نے خوارج و منکرین کے مقابلہ میں فرمایا تھا کہ "میں قرآن ناطق ہوں" تو میں اسکی تصدیق کرنے کے لئے طیار ہوں۔ اگرچہ حقیقت ناشناس طبیعتیں سمجھتی ہیں کہ یہ بہت ہی بڑا دعویٰ تھا۔ یقینًا یہ بڑے سے بڑا دعویٰ تھا جو کوئی انسان کر سکتا ہے لیکن اگر حضرت امیرؓ نے کیا تھا تو غلط نہ تھا۔ اگر انکی مقدس زندگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے "اسوۂ حسنہ" کا ایک کامل عکس تھا، اور انکے اعمال کی روشنی سراج منیر رسالت ہی سے ماخوذ تھی، تو کیوں انہیں یہ حق نہ تھا کہ وہ اپنے تئیں "قرآن ناطق" کہیں؟

جو کتاب الٰہی ما بین الدفتین حروف و نقوش کی شکل میں تھی، اسی کی ہستی ناطق تھی جو اعمال حضرت مرتضوی کے اندر سے پکارتی تھی۔ کہ یہ علی بن ابی طالب کی آواز ہے، لیکن ابوذرؓ اور سلمانؓ کی حقیقت شناسی جانتی تھی کہ یہ علیؓ بن ابی طالب کی آواز نہیں ہے، بلکہ "القرآن الحکیم" کی صدائے الٰہی ہے، اور چونکہ "القرآن"

نمونے بھی انسانوں کے سامنے نہ ہوں۔ جو اثر طبیعت منفعلہ انسانیہ پر ایک انسانی نمونہ عمل کا پڑتا ہے وہ محض تعلیم کی سماعت سے نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ اخلاق کی کتابیں اپنی مؤثر تعلیمات سے انسانوں کو رُلا دسکتی ہیں مگر اُس کے دلوں کو نہیں پھیر سکتیں۔ عدالت کا قانون مجرم کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دسکتا ہے لیکن اُس کو جرم سے باز نہیں رکھ سکتا۔ حکماء کے حکیمانہ نصائح نیکیوں کی بڑی بڑی تعریفیں اور بُروں کی بڑی بڑی بُرائیاں بتلا سکتی ہیں۔ لیکن کسی بُرے انسان کو نیک نہیں بنا سکتے۔

بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

لیکن برخلاف اس کے اگر ایک پاک اور مزکی انسان اپنی زندگی کے اندر نیکی کا عملی نمونہ رکھتا ہو اور اس کے اعمال حیات راست بازی کے لئے "اسوہ" کا حکم رکھتے ہوں تو وہ صرف اپنا نمونہ دکھلا کر نہ صرف افراد و اشخاص کو بلکہ اقوام و امم کے اعمال کو یکسر پلٹ دسکتا ہے!

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت خلق اللہ کے لئے صرف کتابوں اور شریعتوں ہی کو نہیں بھیجا بلکہ اُسکے ساتھ انبیائے کرام علیہم السلام کا ذکر ان کے حامل تھے عملی نمونہ بھی دکھلا دیا۔ وہ دستور العمل کی طرف قوم کو بلاتے تھے اُس کا عملی پیکر خود انکی پاک و مطہر زندگی تھی۔ اگر شریعت بصورت قانون تختیوں اور کاغذوں پر منقوش تھی تو بصورت وجود حیّ و قایم انکی زندگی کے اندر بھی پڑھی جا سکتی تھی۔ اگر اسکی آیات بینات، حروف و اصوات کی شکل میں دنیا کو دعوت دیتی تھیں تو انبیائے کرام کی زندگی عمل و فعل کے اندر سے اسکی تصویر دکھلا دیتی تھی اگر قانون کہتا تھا کہ انسان کو ایسا کرنا چاہیئے تو حیاتِ نبوت ثابت کر کے دکھلا دیتی تھی کہ اس طرح کیا گیا اور اس طرح کیا جا سکتا ہے!

یہی حقیقت ہے جس کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اُس وقت بیان کیا تھا جبکہ اُن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اخلاق و اعمال کا حال پوچھا گیا

تھا یعنی جن لوگوں نے کسی پاک و اعلیٰ عمل کا بہترین نمونہ اپنی زندگی میں پیش کیا ہے، اُن کی یاد کو ہمیشہ باقی رکھا جائے تاکہ ان کی یاد کے ساتھ ان کے اعمال کی یاد بھی تازہ ہوتی رہے اور اس کا نمونہ انسانوں کو عزائم امور کی طرف دعوت دے
اب دیکھو کہ قرآن حکیم نے کس طرح دنیا کی اس قدیم ترین رسم کی اصلی حقیقت لیلی، اور کس طرح اس کی آلودگیوں کو اس سے بالکل الگ کردیا؟ اُس نے یادگاروں کے لئے پتھر کے بت نہیں بنائے جن کو حوادث ارضی کا ایک طمانچہ گرا دیسکتا ہے اور جن کا وجود انسان کی عظمت کے لئے ایک سخت داغ تھا۔ اُس نے اینٹ اور چونے کی عمارتیں نہیں بنائیں جو طوفان و برق کے ایک حملہ کی بھی تاب نہیں لاسکتیں اور جن کا اثر ظواہر سے آگے نہیں بڑھتا۔ اُس نے سالانہ مجمعوں اور قومی تقریبوں پر زور نہیں دیا۔ کیونکہ یہ وسائل ہمیشہ ظواہر و رسوم پرستی کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور یادگار کی معنویت مفقود ہو جاتی ہے۔ غرضکہ اُس نے ان تمام وسائل تذکار سے یک قلم انکار کردیا جو عام طور پر تمام قوموں میں رائج تھے اور جن کے ذریعہ خود انسانوں کی بڑائی تو کیجا سکتی تھی پر عمل کی تقدیس و تعظیم کے لئے اُن کے اندر کچھ نہ تھا۔ اور اس لئے ہمیشہ اُن کا وجود انسان کی حقیقت پرستی کی راہ میں ایک سخت پتھر ثابت ہوا تھا۔

سورہ کریمہ فاتحہ

اے عزیزان من!

اب میں تمام تمہیدوں اور مقدمات کی مبادیات سے گذر کر اصل موضوع کے قریب آگیا ہوں۔ اور مجھے زیادہ تیز قدمی کرنی چاہیئے کہ میں نے اپنی تقریر کو سورۂ مبارکہ فاتحہ کی تلاوت سے شروع کیا تھا جسے بظاہر آج کی صحبت سے کوئی

کی آواز ہے، اِس لئے یقیناً خود منزل القرآن کی آواز ہے۔ کنت سمعه الذی یسمع به ولسانه الذی یتکلم به (بخاری)

بہرحال یہ مبحث بجائے خود محتاج تفصیل و نظر ہے مختصر یہ کہ سعادت و ہدایت انسانی کے لئے "تعلیم" کے ساتھ "نمونہ" اور "کتاب کے ساتھ "سنت" ایک ضروری حقیقت ہے۔ اِسی لئے قرآن حکیم نے اپنی تعلیمات کے لئے اس چیز کو ایک اساسی حقیقت قرار دیا۔

لقد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین (۵، ۱۷) بلاشبہ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور ہدایت آیا، اور کتاب الٰہی جس کی تعلیم بالکل واضح و روشن ہے!

اِس آیۂ کریمہ میں "نور" سے مراد حامل قرآن (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وجود اقدس ہے، اور "کتاب مبین" قرآن ہے، یہ "نور" وہی "اسوۂ حسنہ" ہے جو حامل قرآن کی مقدس زندگی میں "علم قرآنی کا وجود عملی" تھا

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (۲۳، ۲۱) بلاشبہ تمہارے لئے اللہ کے رسول کی زندگی پیروی و اتباع کے لئے ایک بہترین نمونہ ہے۔

عربی میں "اسوہ" کا لفظ ہر نمونہ کے لئے کہا جاتا ہے اور نمونہ جس طرح خیر کا ہو سکتا ہے اسی طرح شر کا بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے قرآن حکیم نے حسنہ کے لفظ سے اسے متصف کیا تاکہ واضح ہو جائے کہ فضائل و محاسن ہی کا نمونہ مقصود ہے۔ اسی طرح تمہیں معلوم ہے کہ سورۂ ممتحنہ میں بھی دو جگہ ملت حنیفی و فطری کے اولین موسس حضرت ابراہیمؑ کے متعلق یہی لفظ آیا ہے لقد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معه۔

عود الی المقصود

دنیا میں اعمال مقدسہ و حسنہ کی یادگار قایم کرنے کا مقصد بھی یہی اسوۂ حسنہ

یہ دعاء سورۂ فاتحہ ہے جو ہر مومن دن میں پانچ مرتبہ نماز کی ہر رکعت کے اندر پڑھتا ہے اور وہ نعمت، وہ دولت، وہ متاع مطلوب و محبوب "الصراط المستقیم" ہے جس کے مانگتے رہنے اور طلب کرتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے:

اھدنا الصراط المستقیم" فاتحہ" خدایا! تو ہمیں الصراط المستقیم پر چلنے کی توفیق دے۔ یہ "الصراط المستقیم" کونسی راہ ہے اور اس سے مقصود کیا ہے؟ اس کی یہاں کوئی تشریح نہیں کی گئی۔ البتہ یہ تبلایا گیا ہے کہ:۔

صراط الذین انعمت علیھم (فاتحہ) اُن لوگوں کی راہ جن پر اے پروردگار تو نے انعام کیا۔

پس اس تصریح سے صراط مستقیم وہ راہ ہوئی جو "انعام یافتہ" لوگوں کی راہ ہے۔ یعنی جن لوگوں پر خدا نے اپنی نعمتیں نازل کی ہیں۔ اُنہی کی راہ عمل الصراط المستقیم ہوگی

چنانچہ سورۂ نساء میں "انعام یافتہ" جماعتوں کا بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ "انعمت علیھم" ہیں کن لوگوں کی طرف اشارہ تھا

ومن یطع اللہ والرسول فاولٓئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین و الصدیقین والشھداء و الصٰلحین وحسن اولٓئک رفیقا! (۴، ۷۱)	اور جن لوگوں نے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی، تو وہ سب اُن خوش نصیبوں کے ساتھی ہو جائیں گے۔ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے۔ اور جن پر انعام کیا ہے وہ انبیاء ہیں، صدیقین ہیں، شہداء ہیں اور صالحین ہیں جس کسی کو ایسی انعام یافتہ جماعتوں کی معیت ملے تو کیا اچھی ہے اُسکی معیت اور کیا اچھے ہیں اُسکے رفیق!!

اس آیۂ کریمہ نے صاف صاف بتلا دیا ہے کہ سورۂ فاتحہ میں جس الصراط المستقیم کے تعین کے لئے صرف اس قدر اشارہ کیا گیا تھا کہ وہ "انعام یافتہ" لوگوں کی راہ ہے۔

ربطانہ تھا مگر وہ "السبع المثانی" ہے وہ تمام "الکتاب" کا متن ہے اور وہ اسکی تمام تفصیلات کا وجود اجمالی ہے۔ پھر ہدایات انسانی کا کونسا مقام ہے جو قرآن کے سلطان احاطہ سے باہر رہ گیا ہو؟

غرضکہ قرآن حکیم نے یادگار و تذکار کے ان تمام رسمی و ضلالت آمیز طریقوں سے انکار کردیا جو عام طور پر دنیا نے اختیار کر لئے تھے۔

لیکن جبکہ اُس نے وہ سب کچھ نہ کیا جو سب کوئی کرتے آئے تھے۔ تو سوال یہ ہے کہ خود اُس نے کیا کیا؟

اُس نے "اُسوہ حسنہ" کی اصلی حقیقت کو اپنی تمام تعلیمات کا جزو اعظم بنایا اور اُسکی یادگاروں کو انسانوں سے باہر نہیں جس کو انسان چھوڑ دسکتا ہے بلکہ خود انسان کے اندر قائم کردیا جو کبھی بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوسکتا۔ اُس نے مادی و جسمانی اعمال و اشکال کے اندر اسکی دعوت عمل و سعادت کو گم نہیں کردیا۔ جیسا کہ گم کردی تھی بلکہ اس کو ایک خالص معنوی و روحانی اعتقاد بنا کر اس طرح دلوں کے اندر قائم کردیا کہ اسکی حقیقت دائمی طور پر زندہ ہوگئی اور ہر طرح کی آلودگیوں اور رسم پرستیوں کی آمیزش سے بالکل محفوظ و مصئون بنا دی گئی

اُس نے سب سے پہلے ہمیں ایک مقدس دعا بتلائی اور حکم دیا کہ دن میں پانچ مرتبہ جب اپنے پروردگار کے حضور بندگی و نیاز کے لئے حاضر ہو تو سب سے پہلے اِسی دعا کو پڑھو۔ یہ وہ وقت ہو گا جب تم رب العلمین کے سامنے کھڑے ہوگے اور اُس کی رحمت کا دروازہ باز ہو گا۔ پس ایک عاجز و درماندہ انسان فاطر السموات والارض کے حضور جا کر اپنے لئے سب سے بڑی نعمت اور سب سے زیادہ قیمتی دولت جو مانگ سکتا ہے۔ وہ اس دعا میں مانگی گئی ہے اور چاہئے کہ تم اُسی نعمت کے سائل اُسی مطلوب کے طالب اور اسی محبوب کے عاشق ہو!

کی اور حکم دیا کہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت کرو۔ سورۂ فاتحہ کیا ہے؟ تحمید و تقدیس کے بعد ایک التجا ہے جو انسان اپنے خداوند کے حضور کرتا ہے۔ وہ التجا کیا ہے؟ "الصراط المستقیم" پر چلنے کی التجا ہے۔ تاکہ اس راہ کی اسے توفیق ملے اور سعادت کونین حاصل ہو۔

اب اور آگے بڑھو اور دیکھو کہ الصراط المستقیم کونسی راہ ہے جسے ہر روز دن میں پانچ بار مومن یاد کرتا اور اپنے خدا کے حضور جا کر مانگتا ہے۔ فرمایا کہ وہ ان لوگوں کی راہ ہے جن پر اللہ نے انعام کیا۔ یہاں اس راہ کا طریق حصول یا اس کے عقائد و اعمال نہیں بتلائے گئے بلکہ صرف ان لوگوں کی طرف توجہ دلا دی گئی جنہوں نے ایسے عقائد، ایسے اعمال، ایسے عزائم ایسے اقدام کئے تھے جنکی وجہ سے خدا کی نعمتوں کے مستحق ٹھہرے تھے یہی چیز "یادگار" ہے۔ یہی "تذکار" ہے، یہی وہ "مشاہیر پرستی" کی حقیقت اصلی ہے۔ جس کو تمام دنیا نے ڈھونڈھا مگر نہ پایا۔ وہ کبھی پتھر کے بتوں، کبھی اینٹوں کی عمارتوں، کبھی انسانوں کے مجسموں، کبھی ملکوں اور قوموں کی وقتی رسموں اور تقریبوں میں بھٹک کر رہ گئی۔ اور "صراط الذین انعم اللہ علیہم" کی جگہ "الضالین" کی صراط پر چلی گئی۔

عزیزان من! "مشاہیر پرستی" کے زوائد و باطیل کو چھوڑ دو۔ صرف اسکی اصلی حقیقت کو سامنے لاؤ۔ وہ کیا ہے؟ کیا صرف یہی نہیں ہے کہ جن انسانوں نے دنیا میں بڑے بڑے کام انجام دیے ہیں اور نیکی و صداقت کی راہ پر چلے ہیں اُنکی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھا جائے تاکہ ان کی یاد اُنکے مقدس کاموں اور نیک عملوں کی یاد کو تازہ کردے اور اس یادآوری و تازگی سے قوموں کے لئے پاک ارادوں اور اعلیٰ کاموں کے کرنے کی تحریک ہو؟ اگر یہی ہے تو کیا تم نہیں دیکھتے کہ سورۂ فاتحہ کے اندر یہی حقیقت کس طرح کارفرما ہے؟ سورۂ فاتحہ نے انسان کی راہ سعادت و

وہ کون لوگ ہیں؟ نیز ان کے مختلف مدارج و مقامات کیا کیا ہیں؟ جن جماعتوں کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اور انہیں "انعام یافتہ" کہا ہے۔ انہیں کی راہ حق۔ راہ ہدایت وسعادت ہوگی جس کا نام لسان الٰہی نے "الصراط المستقیم" رکھا ہے اور جس پر چلے بغیر کوئی فرد اور کوئی قوم "مغضوب علیہم" اور "الضالین" کی صراط مغضوبیت وضلالت سے الگ نہیں ہوسکتی۔

سورۂ نساء کی اس آیۂ کریمہ سے "انعمت علیہم" کی مزید تفسیر وتشریح کرنا۔ ایک ایسی مسلّم ومتفق علیہ تفسیر ہے جسے عہد صحابہ واہل بیت نبوت رضوان اللہ علیہم سے لے کر طبقات متاخرہ تک تقریباً تمام ارباب علم ورسوخ نے اختیار کیا ہے اور مفسرین "خاصّہ" و "عامّہ" سب نے اسے قبول کیا ہے۔ چنانچہ جس طرح محدث ابن جریر طبری نے اس کے متعلق مفسرین صحابہ کے آثار جمع کئے ہیں۔ اسی طرح علامہ کلینی اور شیخ طبرسی (صاحب تفسیر مجمع البیان) بھی اس سے انکار نہیں کرتے اس عاجز نے تفسیر البیان میں تصریحات حضرت ائمۂ کرام علیہم السلام واقوال مفسرین خاصّہ بھی نقل کر دیے ہیں۔ فمن شاء التفصیل فلیرجع الیہ۔

بہرحال یہ آیۂ کریمہ بتلاتی ہے کہ جس راہ پر چلنے کی سورۂ فاتحہ میں ہر مومن التجا کرتا ہے۔ وہ راہ "انعام یافتہ" گروہ کی ہے۔ انعام یافتہ گروہ چار ہیں۔ الانبیاء، الصدیقون، الشہداء، الصالحون۔

اب دیکھو کہ قرآن حکیم نے یادگار وتذکار کے اصلی مقصود کو تمام آلودگیوں اور ضلالتوں سے صاف کرکے کس طرح قائم کر دیا ہے۔ اور اس کے لئے کیسی دائم وقائم اور محفوظ ومصئون راہ اختیار کی ہے؟ اس نے نیک انسانوں اور اعلیٰ ترین ہستیوں کی یادگاریں زمین پر قائم نہیں کیں لیکن ان کے اعمال کو ہر مومن کے دل پر نقش کر دیا۔ اس نے ہر مومن باللہ پہ پانچ وقت کی نماز فرض

کر سکتے ہو اور عمارتی و سنگی اشکال میں کبھی کبھی ایک غلط انداز نظر ڈال لے سکتے ہو۔ اس سے زیادہ تمہارے تذکار کی حقیقت کچھ نہیں ہے۔ لیکن دیکھو تمہارے قرآن نے کیسی یادگار قائم کی جو ہر روز دن میں پانچ مرتبہ ہر مومن انسان کے سامنے آتی ہے اور صرف ایک ہی بڑے انسان کو نہیں بلکہ تمام راست باز انسانوں کو جو انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین میں گذرے وہ یاد کرتا اور ان کے اعمال مقدسہ کے نمونوں پر چل کر راہ سعادت کی منزل مقصود تک پہنچنا چاہتا ہے!

عشرۂ محرم الحرام

شمعہا بردہ ام از صدق بخاک شہدا
تا دل و دیدہ خونا بہ فشانم داوند

آئیے سب سے پہلے آج ایک بھولی ہوئی صحبت ماتم کو پھر تازہ کریں۔ کتنے دن گذر گئے کہ راہ و رسم ماتم و شیون سے نا آشنا ہیں۔ نہ صدائے ماتم کی فغان سنجی اور نہ چشم خونبار کی اشک فشانی۔ کاروبار غم کی رونق افسردہ ہو چلی ہے اور بازار و درکی چہل پہل مدت سے موقوف ہے۔

نہ داغِ تازہ مے خارد نہ زخم کہنہ می کارد
بدہ یارب دلے کیں صورت بیجان نمیخوا ہم

طرابلس کے خون آلود ریگستان کو اگر لوگوں نے بھلا دیا، مشہد مقدس و تبریز کا قصۂ الم اگر ذہنوں سے محو ہو گیا، مقدونیا و البانیا کے تازہ ترین افسانہائے خونین اگر فکروں سے فراموش ہو گئے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ ارباب درد و غم کے لئے ایک ایسی

ترقی کیلیے نہ تو عقاید و افکار بیان کئے اور نہ اعمال و افعال، بلکہ ان انسانون کی طرف توجہ دلائی جو انعام یافتہ الٰہی تھے، یعنی جو انسان راہِ سعادت کو حاصل کرنا چاہتا ہے، اُسے چاہیئے کہ انعام یافتہ انسانون کی یاد کو ہر روز اپنے سامنے لائے اور ان کے عقاید و اعمال کے نمونہ کو کبھی فراموش نہ کرے۔ پھر اگر یہ دنیا کی پاک عمل ہستیون کی سچی یادگار اور ان کا حقیقی تذکار نہین ہے تو اور کیا ہے؟ یقیناً یہ تذکار مگر ایسا تذکرہ جو اپنے خصایص کے لحاظ سے تمام تذکار کے لئے اعلیٰ مرتبہ رکھتا ہے!

پھر ان انعام یافتہ لوگون کی تشریح کی کہ وہ انبیاء ہین، صدیقین ہین، شہداء ہین، صالحین ہین۔ پھر ان میں سے ہر گروہ کے وہ اعمال حسنہ جو قرآن حکیم مین مشرح بیان کیے جن سے "الصراط المستقیم" کی راہ سعادت متعین ہوتی ہے۔ قصص القرآن کی اصلی غرض اسی "انعمت علیہم" کی تفسیر سمجھو یہ چار گروہ وہ ہین جن کے اندر نوع انسانی کا تمام اصلح و اسعد حصہ آگیا، اور انسانی عمل کی سچائی جب کبھی ظاہر ہوگی، تو ضرور ہے کہ انہی انعام یافتہ چار جماعتوں میں سے کسی جماعت سے متعلق ہو۔ پس غور کرو کہ تم یادگار یا وگار رہکار رہے ہو۔ تمام دنیا مشاہیر پرستی کے لئے بیقرار ہے۔ کرہ ارضی کی ہر متمدن انسانی جماعت انسانی بڑائیوں کا تذکار کرنا چاہتی ہے لیکن یہ کسی یادگار کی عجیب و غریب خالص حقیقت ہے جو اس کی تمام خرابیوں کو دور کرکے قرآن حکیم نے ہمیں عطا کی ہے۔ دنیا کی ہر قوم صرف اپنے ہی بڑوں کو تذکار کا مستحق سمجھتی ہے اور زیادہ سے زیادہ چند بڑے انسانوں کو یاد رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن قرآن حکیم نے کرہ ارضی کی تمام حقیقی بڑائیوں اور اعمال صالح کے تمام گھرانوں کو چن لیا۔ اور حکم دیا کہ تم ان سب کے نمونوں کو اپنے سامنے رکھو۔ اور سب کے بڑے بڑے کاموں۔ بڑے بڑے عزموں، بڑی بڑی نیکیوں سے اپنی راہ ایمان و اسلام کو مرکب و مقوم بناؤ۔ تم یادگاریں بنا کر سال میں ایک مرتبہ انہیں یاد

ایک کامل ترین مثال قائم کردے۔ پس جو بیخبر ہیں انکو رونا چاہئیے۔ ان لم تبکوا فتباکوا! جو روتے ہیں انکو صرف رونے ہی پر اکتفا نہ کرنا چاہئیے۔ انکے سامنے سیدالشہداء نے اپنی قربانی کا ایک اسوۂ حسنہ پیش کردیا ہے۔ اور کسی روح کے لئے ہرگز جائز نہیں کہ محبت حسین کی مدعی ہو جب تک کہ اسوۂ حسینی کی متابعت کا اپنے اعمال کے اندر سے ثبوت نہ دے۔

ضرورت تھی کہ ایک مبسوط مقالہ اسوۂ حضرت سیدالشہداء کے عنوان سے لکھا جاتا اور نہایت تفصیل کے ساتھ اس حادثہ ہائلہ شہادت پر نظر ڈالی جاتی۔

سب سے پہلے اسکی تاریخی حیثیت نمایاں کیجاتی اور اسکے بعد اُن تمام مواعظ و نتائج عظیمہ کو ایک ایک کرکے بیان کیا جاتا جو اس ذبح عظیم کے اندر پوشیدہ ہیں اور جنکی لسان حیات آج بھی اسی طرح صدا دے رہی ہے جس طرح کنارہ فرات کی ریتلی سرزمین پر اب سے بارہ سو برس پہلے زخم و خون کے اندر سے وعظ فرمائے حقیقت و صداقت تھی!

دنیا میں ہر چیز مرجاتی ہے کہ فانی ہے۔ مگر خون شہادت کے ان قطروں کے لئے جو اپنے حیات الٰہیہ کی روح رکھتے ہیں کبھی بھی فنا نہیں۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانی دیگر ست

لیکن افسوس کہ شرح و بسط کے لئے اس وقت مستعد نہیں صرف چند مجمل اشارات پر اکتفا کرونگا۔ ع

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

(۱) سب سے پہلا نمونہ جو یہ حادثہ عظیمہ ہمارے سامنے پیش کرتا "دعوت الی الحق" اور حق حریت کی راہ میں اپنے تئیں قربان کرنا ہے۔

بنی امیہ کی حکومت ایک غیر شرعی حکومت تھی۔ کوئی حکومت جس کی بنیاد جبر و شخصیت پر ہو کبھی اسلامی حکومت نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے اسلام کی روح حریت و جمہوریت کو غارت کیا اور مشورہ اجماع امت کی جگہ محض غلبہ جابرانہ و مکر و خدع پر اپنی شخصی حکومت

داستان الم صدیوں سے موجود ہے جو کبھی بھلائی نہیں جا سکتی اور اگر لوگ اسے بھلا بھی دیں تو بھی ہر سال چند ایسے ماتم آلود دن تازگی زخم کہن کیلئے آموجود ہوتے ہیں جو از سر نو ایک ہزار ڈھائی سو برس پیشتر کے ایک حادثۂ عظیمہ کی یاد پھر سے تازہ کر دیتے ہیں!

وقتست کہ در پیچ و خم نوحہ سرائی | سر زد نفس نوحہ گر از تلخ نوائی
وقتست کہ آں پردگیاں کز رہ تعظیم | بر در گہ شاں کردہ فلک ناصیہ سائی
از خیمہ آتش زدہ عریاں بدر آمد | چوں شعلہ دُخاں بر سر شاں کردہ روائی
جا نہا ہمہ فرسودہ تشویش اسیری | دلہا ہمہ خوں گشتہ اندوہ رہائی
تنہاست حسین ابن علی در صف اعدا | اکبر تو کجا رفتی و عباس کجائی؟

سچ یہ ہے کہ جن مردہ دلوں کو زندگی کے لئے سوز و تپش کی ضرورت. جن ارباب درد کو روح کی راحت کیلئے جسم کے ماتم کی تلاش ہو، جنکی زبانیں آہ و فغاں کو محبوب اور جنکی آنکھیں خونابہ فشانی کو اپنا مطلوب و مقصود سمجھتی ہوں اُنکی صحبت ماتم و الم کی رونق کے لئے یہی افسانہ اتنا کچھ سامانِ غم اپنے اندر رکھتا ہے کہ اگر خون کے بڑے بڑے سیلاب سمندروں کی روانی سے بہہ جائیں اور بیشمار لاشوں کی تڑپ سے زمین کے بڑے بڑے قطعات یکسر جنبش میں آجائیں جب بھی اُنکی ندا، حال اس الہام سرائی سے قاصر رہیگی جو اس کے ایک ایک لفظ کے اندر سے توصیہ فرمائے عبرت و بصیرت ہے۔

لیکن آہ کتنے دل ہیں جنہوں نے اس واقعہ کو اس کے حقیقی بصائر و معارف کے اندر دیکھا ہے؟ اور کتنی آنکھیں ہیں جو حسین ابن علی شہید پر گریہ و بکا کرتے ہوئے اسوۂ حسنہ کو بھی سامنے رکھتے ہیں جو اس حادثۂ عظمیٰ کے اندر موجود ہے؟

فی الحقیقت یہ حق و صداقت، آزادی و حریت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ایک عظیم الشان انسانی قربانی تھی جو صرف اس لئے ہوئی تاکہ پیروان اسلام کے لئے ایک اسوۂ حسنہ پیش کرے اور اس طرح جہاد حق و عدالت اور اُسکے ثبات و استقامت کی ہمیشہ کے لئے

جہاد سے قطع نظر تمہارے سامنے خود مظلوم کربلا کی مثال موجود ہے تم کہتے ہو کہ چند انسانوں نے حکومتوں کی قوتوں اور ساز و سامان کا مقابلہ کب کیا ہے کہ کبھی بھی کیا جائے ؟ میں کہتا ہوں کہ حسین ابن علی نے صرف ۷۲ یا ۶۲ بھوکے پیاسے انسانوں کے ساتھ اُس عظیم الشان حکومت قاہرہ وجابر کا مقابلہ کیا جسکی حدود سلطنت ملتان اور سرحد فرانس تک پھیلنے والی تھیں اور گو یہ سچ ہے کہ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے دل کے ٹکروں کو بھوک اور پیاس کی شدت سے تڑپتے دیکھا۔ اور پھر ایک ایک کرکے اُن میں سے ہر وجود مقدس خاک و خون میں تڑپا اور جاں بحق تسلیم ہوا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ دشمنوں سے نہ تو پینے کے لئے پانی چھین سکا اور نہ زندہ رہنے کے لئے اپنی غذا حاصل کر سکا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ بالآخر سر سے لے کر پیر تک وہ زخموں سے چور ہوا اور اس خلعت شہادت لالہ گوں سے آراستہ ہو کر تیار ہوا۔ تا اُس کرشمہ ساز عجائب کے حریم وصال میں پہنچے جو دوستوں کو خاک و خون میں تڑپاتا اور دشمنوں کو مہلت دیتا ہے۔ ا سرایل وصالہ وترید قتلی۔

تاہم فتح اُسکی تھی، اور فیروزمندی و کامرانی کا تاج صرف اسی کے زخم خوردہ سر پہ رکھا جا چکا تھا وہ تڑپا اور خاک و خون میں لوٹا پر اپنے اس خون کے ایک ایک قطرہ سے جو عالم اضطراب میں اسکے زخموں سے ریگ و سنگ پر بہتا تھا، انقلاب و تغیرات کے وہ سیلاب ہائے آتشین پیدا کر دیے جن کو نہ تو مسلم بن عقبہ کی خون آشامی روک سکی نہ حجاج کی بے اماں خونخواری اور نہ عبدالملک کی تدبیر و سیاست وہ بڑھتے اور بھڑکتے ہی رہے۔ ظلم و جبر پانی تیل بن کر اُن کے شعلوں کی پرورش کرتا رہا۔ اور حکومت و تسلط کا غرور ہوا بن کر اِن کی ایک ایک چنگاری کو آتشکدۂ سوزاں بناتا رہا۔ یہاں تک کہ آخری وقت آگیا اور جو کچھ ۶۲ھ میں کربلا کے اندر ہوا تھا وہ سب کچھ ۱۳۲ھ میں نہ صرف دمشق بلکہ تمام عالم اسلامی کے اندر ہوا۔ صاحبانِ تاج و تخت خاک و خون میں تڑپے

کی بنیاد رکھی۔ اور مشورہ اجماع امت کی جگہ محض اغراض نفسانیہ و مقاصد سیاسیہ ایسی حالت میں ضرور تھا کہ ظلم و جبر کے مقابلہ کی ایک مثال قائم کی جاتی اور حق و حریت کی راہ میں جہاد کیا جاتا۔

حضرت سید الشہداء نے اپنی قربانی کی مثال قائم کرکے مظالم بنی امیہ کے خلاف جہاد حق کی بنیاد رکھی۔ اور جس حکومت کی بنیاد ظلم و جبر پر تھی اس کی اطاعت و وفاداری سے انکار کر دیا۔

پس یہ نمونہ تعلیم کرتا ہے کہ ہر ظالمانہ جابرانہ حکومت کا علانیہ مقابلہ کرو اور کسی ایسی حکومت سے اطاعت و وفاداری کی بیعت نہ کرو جو خدا کی بخشی ہوئی انسانی حریت و حقوق کی غارتگر ہو جس کے احکام مستبدہ و جابرہ کی بنیاد صداقت و عدالت کی جگہ جبر و ظلم پر ہو۔

(۲) مقابلہ کے لئے یہ ضرور نہیں کہ تمہارے پاس قوت و شوکت مادی کا وہ تمام ساز و سامان موجود ہو جو ظالموں کے پاس ہے۔ کیونکہ حسین ابن علی کے ساتھ چند ضعفاء و مساکین کی جمعیت قلیلہ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ حق و صداقت کی راہ نتائج کی فکر سے بے پرواہ ہے نتائج کا مرتب کرنا تمہارا کام نہیں یہ اس قوت قاہرہ عادلہ الٰہیہ کا کام ہے جو حق کو باوجود ضعف و فقدان انصار کے کامیاب و فتحمند کرتی اور ظلم کو باوجود جمعیۃ و عظمت دنیوی کے نامراد و نگوسار کرتی ہے:۔ وکم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ۔

ایسے موقعوں پر ہمیشہ مصلحت اندیشیوں کا خیال دامنگیر ہوتا ہے جو فی نفسہ اگرچہ عقل و دانائی کا ایک فرشتہ ہے۔ لیکن کبھی کبھی شیطان رجیم بھی اسکے بھیس میں آکر کام کرنے لگتا ہے نفس خادع حیلہ تراشیاں کرتا ہے کہ صرف اپنے تئیں کٹوا دینے اور چند انسانوں کا خون بہا دینے سے کیا حاصل؟ توپ و تفنگ اور تخت و سلطنت کا مقابلہ کس نے کیا ہے کہ ہم کریں!

آخری سوال کا جواب میں دے سکتا ہوں۔ تاریخ عالم کی صدہا امثال مقدسہ و محترمہ

ولنبلونکم بشیٔ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات وبشر الصابرین اذا اصابتھم مصیبة قالوا: انا للہ و انا الیہ راجعون (۲-۱۵۲)	اللہ تعالیٰ تمہیں آزمائشوں میں ڈالیگا وہ حالت خوف و ہراس، بھوک اور پیاس، نقصان مال وجان اور ہلاکت اولاد و اقارب میں مبتلا کر کے تمہارے صبر و استقامت کو آزمائیگا۔ پس اللہ کی طرف سے بشارت ہے ان کیلئے جن کے ثبات و استقامت کا یہ حال ہے کہ جب مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے تمام معاملات یہ کہہ کر اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں

کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خوف وہراس، بھوک اور پیاس، نقصان اموال و متاع، قتل نفس و اولاد یہی چیزیں انسان کے لئے اس دنیا میں انتہائی مصیبتیں ہو سکتی ہیں اس لئے انہی چیزوں کو راہ الٰہی کے لئے آزمائش قرار دیا گیا۔

لیکن مظلوم کربلا کے سامنے یہ تمام مرحلہ ایک ایک کر کے موجود تھے وہ ان تمام مصائب سے ایک لمحہ کے اندر نجات پاکر آرام و راحت و شوکت و عظمت کر سکتا تھا۔ اگرچہ حکومت ظالم کی وفاداری و اطاعت کا عہد کر لیتا اور حق و صداقت سے روگردانی کے لئے مصلحت وقت کی تاویل پر عمل کرتا۔ پر اس نے خدا کی مرضی کو اپنے نفس کی مرضی پر ترجیح دی اور حق کا عشق زندگی اور زندگی کی محبتوں پر غالب آگیا۔ اُس نے اپنا سر دیدیا کہ انسان کے پاس حق کے لئے یہی ایک آخری متاع ہے پر اطاعت و اقرار وفاداری کا ہاتھ نہ دیا۔ جو صرف حق و عدالت ہی کے آگے بڑھ سکتا تھا:۔ ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ واللہ رؤف بالعباد۔

(۹) سب سے بڑا اسوۂ حسنہ کہ اس حادثۂ عظیمہ کی لسانِ حال اُس کی ترجمانی کرتی ہے۔ راہ مذاہب و جہاد حق میں صبر و استقامت اور عزم و ثبات ہے کہ۔ ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا دوسری جگہ کہا: فاستقم کما اُمرت ۔ وللہ دَرُّ مَا قال

ان کی لاشین گھوڑون کے سموں سے پامال کی گئین۔ فتحمندون نے قبرین تک اکھاڑ ڈالین اور مردون کی ہڈیان تک کو ذلت وحقارت سے محفوظ نہ چھوڑا اور اس طرح فسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون! کا پورا پورا اظہار ہوا!

پھر کیا یہ سب کچھ جو ہوا محض ابراہیم عباسی کی دعوت اور ابو مسلم خراسانی کی خفیہ ریشہ دوانیوں کا ہی نتیجہ تھا؟ کیا یہ اُسی خون کا نتیجہ تھا جو فرات کے کنارے بہایا گیا تھا! پھر یہ فتحمندی تو ظاہر ہے جسکے نتائج کے لئے ایک صدی کا انتظار کرنا پڑا ورنہ فی الحقیقت مظلومیت کا خون جس وقت بہتا ہے اُسی وقت اپنی معنوی فتحمندی حاصل کرلیتا ہے۔

(۳) بہرحال یہ تو حق وصداقت کی قربانیوں کے نتائج ہیں جو کبھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ لیکن حضرت سید الشہداء کا اسوۂ حسنہ تبلاتا ہے کہ تم اُن نتائج کی ذرا بھی پروا نہ کرو۔ اگر ظلم اور جابرانہ حکومت کا وجود ہو تو اس کے لئے حق کی قربانی ناگزیر ہے اور اُسے ہونا ہی چاہیئے۔ تعداد کی قلت وکثرت یا سامان و وسائل کا فقدان اُس پر موثر نہیں ہوسکتا۔ اور ظلم کا صاحب عظمت وشوکت ہونا اس کے لئے کوئی الٰہی سند نہیں ہے کہ اُسکی اطاعت ہی کرلیجائے۔ ظلم خواہ ضعیف ہو یا قوی ہرحال میں اُس کا مقابلہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ ظلم ہے اور حق وصداقت ہرحال میں یکساں اور غیر متزلزل ہے۔

(۴) حق وعدالت کی رفاقت کی آزمائشیں زہرہ گداز وشکیب ربا ہین۔ قدم قدم پر حفظ جان وناموس اور محبت فرزند وعیال کے کانٹے دامن کھینچتے ہین۔ لیکن یہ اسوۂ حسنہ مومنین ومخلصین کو درس دیتا ہے کہ اس راہ مین قدم رکھنے سے پہلے اپنی طلب وہمت کو اچھی طرح آزمالین یہ نہو کہ چند قدموں کے بعد ہی ٹھوکر کھا کے گرین۔

جرم را این جا عقوبت ہست و استغفار نیست

اس قتیل جادۂ حق وصداقت کے چارون طرف جو کچھ تھا اس کا اعادہ ضروری نہیں کہ سب کو معلوم ہے خدا تعالیٰ نے اپنی آزمائشون کے متعدد درجے بیان کئے ہین۔

یا دھر اف لک من خلیل کم لک فی الاشراق والاصیل
من طالب وصاحب قتیل والدھر لا یقنع بالبدیل
وانما الامر الی الجلیل وکل حی سالک السبیل

ففہمت ما قال وعرفت ما اراد وخنقتنی عبرتی ورددت دمعی وعرفت ان البلاء قد نزل بنا، واما عمتی زینب فانہا لما سمعت ما سمعت والنساء من شانہن الرقۃ والجزع فلم تملک ان وثبت تجر ثوبہا حاسرۃ وھی تقول واثکلاہ! لیت الموت اعدمنی الحیاۃ، الیوم ماتت فاطمہ وعلی والحسن بن علی اخی، فنظر الیہا فرد دغصۃ ثم قال یا اختی! اتقی اللہ! فان الموت نازل لا محالۃ فلطمت وجہہا المساء وقال لہا یا اختاہ! تعزی بعزاء اللہ فان لی ولکل مسلم اسوۃ برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (تاریخ یعقوبی مطبوعہ لیڈن جلد دوم صفحہ ۲۹۰)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت امام علی بن حسین زین العابدین علیہ السلام کہتے ہیں:۔

جس رات کی صبح کو میدان شہادت گرم ہونیوالا تھا عین اسی شب کا واقعہ ہے کہ میں بیمار پڑا تھا۔ میری پھوپی زینب میری تیمارداری میں مصروف تھیں اتنے میں حضرت امام حسین داخل ہوئے اور چند اشعار پڑھ رہے تھے جنہیں سُن کر میں سمجھ گیا کہ ان کا ارادہ کیا ہے؟ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور مجھے یقین ہو گیا کہ ہم پر ابتلائے الٰہی نازل ہو گئی ہے اور اب اس سے چارہ نہیں۔ مگر حضرت زینب ضبط نہ کر سکیں کیونکہ قدرتی طور پر عورتیں زیادہ رقیق القلب ہوتی ہیں وہ ماتم کناں چلا اٹھیں کہ واحسرتا وامصیبتا! الیوم ماتت فاطمہ وعلی والحسن بن علی! لیکن جب حضرت حسین نے یہ حالت دیکھی تو ان کی جانب متوجہ ہوئے اور کہا کہ اے بہن یہ کیا بے صبری اور کیا جزع وفزع ہے؟ اللہ سے ڈر کہ موت یقیناً

روئے کشادہ باید و پیشانی فراخ   آں جا کہ لطمہ ہائے بلا دمی زنند

فی الحقیقت اس شہادت عظیمہ کی سب سے بڑی مزیت و خصوصیت یہ ہی کہ اپنے تمام عزیز و اقارب اہل و عیال اور فرزند و احباب کے ساتھ دشت غربت و مصائب میں محصور اعدا ہونا اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے جگر گوشوں کو شدت عطش و جوع سے آہ و فغاں کرتے ہوئے دیکھنا پھر اُن میں سے ایک ایک کی خون آلود لاش کو اپنے ہاتھوں سے اُٹھانا حتیٰ کہ اپنے طفل شیرخوار کو بھی تیر ظلم و بربریت سے نخچیر پانا۔ مگر با ایں ہمہ راہ عشق و صداقت میں جو پیمان صبر و استقامت باندھا تھا اس کا ایک لمحہ بلکہ ایک عشر دقیقہ کے لئے بھی متزلزل نہ ہونا اور حق کی راہ میں جسقدر مصائب و اندوہ پیش آئیں سب کو شکر و منت کے ساتھ برداشت کرنا کہ: رضینا بقضاء اللہ وصبرنا علی بلائہ

پیکاں ترا بجاں خریدار   من مرہم دیگراں نخواہم

دوست کے ہاتھ سے جام زہر بھی ملتا ہے تو تشنہ کامان زلال محبت اُسے غیروں کے جام شہد و شکر پر ترجیح دیتے ہیں۔ ع اے جفاہائے تو خوشتر ز وفائے دگراں!

آج بھی اگر گوش حقیقت نیوش باز ہو تو خاک کربلا کا ایک ایک ذرہ توصیہ فرمائے صبر و استقامت ہے۔

شدیم خاک و لیکن بوئے تربت ما   تواں شناخت کزیں خاک مردمی خیزد

افسوس کہ تفصیل مطالب کا ارادہ نہیں اور وقت و گنجایش مقتضی اجمال و ایجاز اگر اس صبر و استقامت کے اسوۂ حسنہ کو دیکھنا چاہتے ہو تو خدارا اسفار تاریخ کی طرف توجہ کرو صرف ایک روایت یہاں لکھونگا تاکہ جو لوگ خاندان نبوت او رعترت حضرت رسالت کی محبت کا دعویٰ رکھتے ہیں وہ غور کریں کہ ادعا محبت بغیر متابعت بیکار ہے:۔ ان المحب لمن یحب یطیع

حضرت امام علی بن الحسین الشہیر بہ زین العابدین کہتے ہیں:۔ انی جالس فی العیشۃ التی قتل ابی الحسین فی صبیحتہا وعمتی زینب تمرضنی اذ دخل ابی وھو یقول

ایک آنیوالی چیز ہے اور اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔

لیکن حضرت زینب شدتِ غم وحزن سے مضطرب تھیں وہ دیکھ رہی تھیں کہ آنیوالی صبح کن واقعات خونیں کے ساتھ طلوع ہوگی۔ فرطِ غم میں انہوں نے اپنا چہرہ پیٹ لیا، گریبان پھاڑا اور واویلا! واحسرتا! پکارتی ہوئی بے ہوش اپنے بھائی پر گر پڑیں۔ حضرت حسین نے یہ حالت دیکھ کر اُن کے مُنہ پر پانی ڈالا اور جب ہوش میں آئیں تو فرمایا:۔

اے بہن! یہ کیسا غم وحزن ہے جو تم کر رہی ہو؟ تمہیں چاہیئے کہ اللہ کے حکم و فرمان کے مطابق جو طریق عزا وحزن وغم ہے اُسے اختیار کرو۔ کیونکہ میرے لئے اور ہر ایک مسلم کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور اُن کے اعمال و افعال میں اتباع اور پیروی کے لئے بہترین نمونہ ہے!

اللہ اکبر خاندان نبوت کے اس مرتبہ رفیع اور درجہ عظیم کو دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ کس طرح اُن کے سامنے تھا۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ کے آگے کس طرح انہوں نے اپنے جذبات اور خواہشوں کو قربان کر دیا تھا؟ ایسے سخت اور زہرہ گداز موقع پر بھی اپنی بہن کا جزع و فزع انہیں گوارا نہ ہوا اور بجائے عام الفاظ صبر و تشفی کہنے کے فرمایا تو یہ فرمایا کہ

فان لی ولکل مسلم اسوۃ فی رسول اللہ علیہ وسلم